ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.4 2023

ادب اور اظہارِ ذات۔۔۔۔نرگسیت کے آئینے میں

ڈاکٹر محمد عطااللہ
اسسٹنٹ پروفیسر، لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور
شائستہ پروین
پی ایچ ڈی اسکالر،جی سی یو ،لاہور
اسلم حمید
پی ایچ ڈی اسکالر،جی سی یو ،لاہور

Abstract
Narcissism is a complex behavior of human being and when it comes to literature it becomes more complicated to understand and explain the narcissism which in literature is often hidden under the lairs of symbols and metaphors. Literature is of course an expression of one's personality and a writer always tries to show his own self in the form of characters but sometimes this expression is so loud and the writer is so possessed by his own ideas that he or she at times dominates the nature of poor character who in spite of being a part of story, becomes the reflection of the writer. Literature, particularly prose and short stories are associated with the social norms and traditions. Values, weather moral or religious, are always a part of prose and reflect the collective psyche of the society. In this particular essay, it is tried to explain the behavior of an individual and the society with reference to the difference between narcissism and the expression of personality.

Key Words: Narcissism, personality, expression of one's personality, social norms, collective psyche

کلیدی الفاظ: نرگسیت۔ شخصیت۔ اظہارِ ذات۔ سماجی اقدار۔ اجتماعی نفسیات

ادب انسانی زندگی کی ایک ایسی تصویر ہے جس میں انسانی جذبات و احساسات کے علاوہ مشاہدات و تجربات اور خیالات کی جھلک بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ادب کی تخلیق کے بارے میں مختلف مکاتیب فکر وجود میں آئے۔ ان میں ایک مکتبہ فکر ان دانشوروں کا بھی ہے جو شعر و ادب کو نیم شعوری اور غیر شعوری زندگی کا عکاس سمجھتے ہیں۔ یہ نظریہ فرائیڈ کے نظریہ تحلیلِ نفسی اورژونگ کےArchetypal نظریات کو فن پارے کا تجزیہ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے جس میں فنکار کی داخلی کائنات کے سربستہ رازوں کو دریافت کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ فرائید مکتبہ فکر نے ادبی و فنی تخلیقات کا رشتہ فن کار کے داخلی مسائل سے قائم کیا۔ فرائیڈ کے مطابق ہر انسان کی شخصیت اس کے سماجی دباؤ اور رشتوں کا مظہر ہے ۔ اس نے نفس کو ایک مکمل وجود قرار دیا ہے۔ ژونگ کے خیال میں بنیادی جبلت جنسی نہیں بلکہ ہمہ گیر نفسی قوت ہے جسے قوت کی خواہش کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ژونگ نے مثالی شخصیتArchetype کے فلسفے کے تحت اپنی تجرباتی نفسیات کی تفہیم و تعبیر کی۔ جبکہ ایڈلر کے خیال میں تمام نفسی امراض کسی ذلت یا شکست کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں اور انسان ان کی تلافی کے لیے عظمت یا شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ وصف نفسیاتی اصطلاح میں نرگسیت کا حامل ٹھہرتا ہے۔ اُردو فکشن میں اس کی واضح مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اکرام اللہ کا ناولٹ ''گرگِ شب'' اور بانو قدسیہ کا ناول ''راجہ گدھ'' نمونہ کے طور پر معاشرے کے افراد کی نفسیاتی و جذباتی انتشار کا نوحہ ہیں۔ ''راجہ گدھ'' کے متعلق اشرف لکھتے ہیں؛

"بانو قدسیہ کا ناول ''راجہ گدھ'' 1981ء کے ایک مخصوص نفسیاتی فلسفے کی دلالت کرتا ہے۔"[1]

یہ ناول کالج کے طالب علموں آفتاب اور سیمی کے عشق سے شروع ہوتا ہے۔ آفتاب پرانے لاہور کے کشمیری تاجروں کاPampered Child ہے جبکہ سیمی شاہ گلبرک کے ایک بیوروکریٹ کی دانشور بیٹی ہے۔ سوشیالوجی کا نوجوان پروفیسر سہیل آفتاب اور سیمی کے درمیان نہایت خاموش سے شکوک پیدا کرکے دونوں کو الگ کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آفتاب سیمی کو چھوڑ کر اپنے والدین کی پسندیدہ لڑکی زیبا سے شادی کرکے لندن چلا جاتا ہے۔ اِدھر سیمی شاہ آفتاب کی محبت میں اُس منزل تک پہنچ چکی ہے کہ وہ آفتاب کے رومیٹ قیوم کے ساتھ آفتاب کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کی یادیں تازہ رکھتی ہے۔ آفتاب کے جانے کے بعد سیمی قیوم کی جنسی خواہشات کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ہے لیکن اس کا ذہن اور دل آفتاب کے ہجر میں بدستور گریہ کناں رہتا ہے۔ قیوم کی رفاقت سیمی کے لیے آفتاب کے سحر سے باہر نکلنے میں ذرا بھی معاون ثابت نہیں ہوتی بلکہ سیمی زندگی اور سماجی بندھنوں سے جان چھڑا کر مریضانہ زندگی گزارتی ہوئی بالآخر موت سے ہم کنار ہو جاتی ہے۔ اِدھر قیوم سیمی کے بعد ایک سماجی اجنبی(Misfit)بن کر اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا ہے۔ ایک شادی شدہ عورت عابدہ اور ایک طوائف کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ راجہ گدھ مصنفہ کے اس مذہبی نظریے پر دلالت کرتا ہے کہ رزقِ حرام دیوانگی اور (Maladjustment)کا باعث بنتا ہے

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.4 2023

اور یہ کہ ناجائز جنسی تعلقات مذہب کی رو سے حرام ہیں۔ گویا بانو قدسیہ نے سماجی نفسیات اور مذہب کے التزام سے نرگسیت کی حامل صورتِ حال کو بیان کیا ہے۔

پاکستان میں اُردو افسانے کو اپنی ابتدا سے ہی بہت سے بحرانوں سے دوچار ہونا پڑا۔ تقسیم کا المیہ اور اس کے ردِعمل میں پیدا ہونے والے نفسیاتی اور جذباتی مسائل، مختلف سطحوں پر تہذیبی عکاسی، جدیدیت کا رجحان، تکنیک میں نئے تجربات اور تجریبی و علامتی رجحان کے لبادے میں افسانہ نگاروں نے ڈر، خوف اور ذہنی انتشار اور کھوئے ہوئے انسانی کی بازیافت کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اس اُبھرتے رجحان و میلان کی عکاسی خاننے اپنی تصنیف ''اُردو افسانے میں رومانی رجحانات'' میں کی ہے۔

> " پاکستان میں اُردو افسانے کے نمائندہ رجحانات میں اسی فرد کی تلاش، شناخت یا بازیافت اور تعمیر کی خواہش ملتی ہے جو قیامِ پاکستان سے پہلے افسانہ نگاروں کے ہاں پائی جاتی تھی۔ تقسیم کے بعد افسانہ نگاروں نے زندگی کی قریب ترین حقیقتوں سے کہانی کے تار و پود جمع کیے جس میں ہجرت کا دکھ بہت نمایاں ہے۔ اس دکھ کی توضیح سیاسی حوالے سے تو یقیناً مختلف انداز سے کی گئی ہے لیکن افسانہ نگاروں نے اسے وسیع تر انسانی بنیادوں پر ایک تاریخی سانحے سے منسلک کیا ہے۔ بچھڑ جانے والوں کی یادیں نظروں سے اوجھل ہوچکیں۔ گلی کوچے، مہربان چہرے اور دم توڑتی رفاقتیں ایک کسک بن کر افسانوں کی فضا کو اُداس اور غمگین بنا دیتی ہیں۔"[2]

چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو افسانے میں طرزِ احساس تو پہلے بھی تھا لیکن وہ دیکھ، سکھ، محبت اور رفاقتیں قربتوں کے جلو میں پروان چڑھتی تھیں اور ایک ہی بوباس میں پرورش پاتی تھیں لیکن تقسیم کے بعد جدائی کا تجربہ ایک اجتماعی آشوب میں تبدیل ہو گیا اور رومانی طرزِ احساس انفرادی کرب کی سرحدیں عبور کرکے اجتماعی تجربے میں ڈھل گیا۔ یہ انداز انتظار حسین اور قراۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری میں بہت بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ ان کے کردار ماضی کی حسین وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں یا تاریخ کے عظیم عہد میں سانس لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ممتاز مفتی کے کردار ذات کے پاتال میں اُتر کر رازِ ہستی کو بوجھنے کے عمل میں مصروف ہیں اور حیات کے تحیر اور اسرار میں گم ہیں۔ اشفاق احمد محبت، رومان اور روح کے خلاف تثلیت میں ایسے کرداروں کو تخلیق کرتے ہیں جو تقدیر کے ہاتھوں کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے ہیں۔ شوکت صدیقی کے افسانوی کردار انسان کے اندر کے کرب سے نجات پانے کے لیے ماضی میں پناہ لیتے ہیں اور مہکتی وادیوں میں زندگی تلاش کرتے ہیں۔ خدیجہ مستور کے کردار جنسی گھٹن اور تشنہ کام جذبات کے سہارے اپنی تکمیل کرتے ہیں۔

ادبا اور فن کار جب ہجرت کے مراحل سے گزرتے ہیں تو انہیں نئے ماحول سے ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے میں شدید دشواریوں کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ بالعموم ان کے یہاں یادِ ماضی، جڑوں سے کٹ جانے کا المیہ، تنہائی، اجنبیت، ذہنی کرب اور دیگر بہت سے جذباتی اور نفسیاتی نوعیت کے سوالات اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ معاملاتِ حیات اس وقت زیادہ گھمبیر ہو جاتے ہیں جب نئے لوگوں میں آ کرانہیں معاشی تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ ایسے میں نسلی، مذہبی اور تمدنی حوالے سے بہت سی رکاوٹوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لہٰذا ''ہجرت'' کے زاویہ سے تخلیق پانے والے ادب کے لیے باقاعدہImmigrant Literature کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ تقسیمِ ہند اور سقوطِ ڈھاکہ کے نتیجے میں تخلیق کردہ ادب اور فکشن پر قزلباش اپنا تجزیہ پیش کرتے ہیں کہ :

> "جہاں اُردو افسانہ میں ہجرت کے مسائل کو موضوع بنانے کا معاملہ ہے تو اس کام کا آغاز 1947ء میں برصغیر کی تقسیم سے ہو گیا تھا۔ گو کہ اس موضوع پرزیادہ موثر اور غیر جذباتی نقطہ نظر کے حامل افسانے تقسیم کے آٹھ دس سال بعد منظرِ عام پر ائے۔" [3]

تاہم 1947ء میں وقوع پذیر ہونے والی تاریخ کی غالباً سب سے بڑی ہجرت نے سرحد کے آرپار جن افسانہ نگاروں کو اس انتہائی حساس، جذباتی اور نازک موضوع پر لکھنے پر مائل کیا ان میں سے سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ہجرت کے المیے کو جدید افسانہ نگاروں نے ایک ذہنی تجربے کے طور پر خود پر وارد کیا اور بغیر کسی سیاسی مصلحت کے، آزادانہ طور پر 1947ء کے فسادات اور ہجرت کے مسائل کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ کلام حیدری، مسعود اشعر، احمد یوسف اور زاہدہ حنا وغیرہ نے بڑی ہنرمندی سے اپنے افسانوں میں ہجرت کے پیدا کردہ معاشرتی، معاشی، نفسیاتی، جذباتی اور تہذیبی گوشوں کو بے نقاب کیا۔ جدید اُردو افسانے نے سقوطِ ڈھاکہ کے باعث عمل میں آنے والی ہجرت کے مختلف زاویوں کو بھی چابکدستی سے نمایاں کیا ہے۔ اس انتہائی دل خراش اور اندوہ گیں موضوع پر متعدد پُراثر افسانے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اس سلسلے میں شہزاد منظر، مسعود مفتی،

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.4 2023

علی حیدر ملک، کلیم الدین، رحمان شریف، انیس صدیق، غلام محمد، احمد زین الدین، زین العابدین، س۔م ساجد، احمد سعدی، ایوب جوہر، رخسانہ انیس، شہناز پروین وغیرہ شامل ہیں۔

دنیائے ادب میں جنس پرستی کے رجحانات اور عوامل کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ مغرب سے یہ اصطلاح مشرق کے ادبا و شعرا نے اختیار کی۔ اس سلسلے میں ادب اور نفسیات کو واضح کرنے کے لیے گوناگوں نظریات سامنے آئے۔ ادب میں نفسیاتی صداقت کیا ہے؟ ادبی تخلیقات میں نفسیاتی نرگسیت اور نقطہ نظر کو کیا مقام حاصل ہے۔ اِسّر ادب میں لاشعوری قوت، ذہنی کیفیات اور جنسی نرگسیت کے عوامل کے گوناگوں رجحانات کے مباحث پر بات کرتےہوئے کہتے ہیں کہ ؛

> "ان تمام رجحانات کا سرچشمہ لاشعوری محرکات ہیں۔ عورت اور مرد کی باہمی جنسی کشش اور خواہشِ وصل جسے یونانی دیومالا نے تخیلی طور پر اور سون برن نے فنی طور پر پیش کیا ہے۔ اس کے خلاف تجربہ کا پرچار کیوں؟ تجرید پرستوں کو یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ جنسی جذبہ فطری ہے اور خواہشِ وصل بھی فطری ہے۔ انہوں نے بھی جنسی ناآسودگی کی اذیت ضرور محسوس کی ہو گی لیکن انہیں یہ ذہن نشین کرانا ضروری ہے کہ جنسی جذبہ صرف انسانی نسل کی افزائش اور بقا کے لیے ہی لازمی نہیں بلکہ ادب اور فن کی انسپریشن بھی جنسی جذبہ ہی ہے۔ پھر بھی جب اس قوتِ حیات کو ادب و فن میں پیش کیا جاتا ہے تو ریاست، سماج، مذہب، اخلاق، روایت اور رائے عامہ سب حرکت میں آ جاتے ہیں اور ایسے ادب کو مخربِ خلاق، فحش اور خلافِ تہذیب قرار دے کرامتناع کا نعرہ لگاتے ہیں۔ یہ کیسی تہذیب ہے جس کی بنیاد نفس کشی ہے اور جس کی منتہا موت ہے۔ "[4]

ہمارا سماج جنسی کشش کے اس فطری جذبہ کو ایک نارمل صحت مند نقطہ نظر سے سمجھنے میں نہ صرف ناکام رہا ہے بلکہ کسی روایتی اور جھوٹے اخلاق کے باعث فرار اور کجروی کا شکار رہا ہے اور اب بھی ہے۔ حالاں کہ تہذیب کا ادب سے اہم اور تخلیقی فریضہ یہی رہا ہے کہ وہ اس جذبے کا صحیح مقام متعین کرے اور اسے تکمیل کے نقطۂ عروج پر پہنچا دے۔

لاشعور نے فنونِ لطیفہ میں نئے نئے اشاروں کو جنم دیا اور فن کاروں کے طرزِ تخلیق میں ایک نئی جہت کو درخشندہ کر دیا۔ جدید نفسیات کی روشنی میں فن کاروں نے اپنی ادبی جہات کو حُسنِ ادا سے مزین کر دیا۔ ادیب، مصور اور بُت تراش کے وہ کارنامے جو دھندلکوں میں گم تھے۔ نفسیات کے نرگسی عوامل کی بدولت حُسنِ تخلیق بن کر سامنے آئے۔ رحمن ادب اور نفسیات پر رقمطراز ہیں؛

" ادب کی تخلیق کے ذمہ دار فن سے زیادہ اُس کا ماحول ہوتا ہے۔ اس دور میں سگمنڈ فرائیڈ اور ینگ کے بورژوا تحریروں سے فنکار اس لیے متاثر ہوئے کہ ان کے ماحول میں فرائیڈ کی چیخ و پکار بہت ہی زور و شور سے پھیل رہی تھی۔ مزدوروں کی حمایت کرنے والے فن کار بھی فرائیڈ، آڈلر اور ینگ کی بورژوا ذہنیت سے متاثر ہو کر اپنی تخلیق میں مشغول ہو گئے۔ یہ جانتے ہوئے کہ شعور کی رو ادب کے لیے زہر بھی ہے، نظامِ نفسی سے ادب میں گندے کیڑے بھی رینگنے لگتے ہیں اور اشتراکیت اور تحلیلِ نفسی کے راستے جدا ہیں۔ روسی ادیب اس سے کافی متاثر ہوئے۔ روسی فنکار بھی اپنے بین الاقوامی ماحول کی ان پرچھائیوں سے خود کو الگ نہ کر سکے۔"[5]

جدید نفسیات سے دنیا کا جو ماحول بھی ادب سے متاثر ہوا ہے اس میں ہمہ گیری، گہرائی اور بے شمار حسین وسعتیں ہو گئی ہیں۔ شعور اور لاشعور کے ہنگاموں سے فن کار کی تخلیق میں زندگی آ جاتی ہے اور اس طرح فن کار کو اپنے فن میں لافانی چیزیں چھوڑنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ لاشعور جب شعور کے خلاف محاذ بناتا ہے تو اس بغاوت کے اثرات سے فن کار دور نہیں رہ سکتے۔ موجودہ ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ تخلیقی کام کی بنیاد انسان کی وہ اصلی جبلتیں ہیں جو فطری طور پرموجود رہتی ہیں۔ یہ جبلتیں کبھی علیحدہ نہیں رہتیں بلکہ ایک دوسرے سے مل کر فنی تخلیق میں مصروف رہتی ہیں۔

دہشت گردی اور ہجرت کے موضوعات کو اُردو فکشن میں اپنے تمام تر عوامل و اثرات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ افغانستان پر روسی جارحیت اور اس کے باعث چھڑنے والی جنگ اور اس کی تباہ کاریوں نے افغانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو سرحد پار کرکے پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس طویل المعیاد ہجرت نے پاکستانی معاشرے کو بھی متاثر کیا۔ منشیات اور کلاشنکوف کلچر نے پاکستان کی نوجوان نسل پر منفی اثرات مرتب کیے۔ چناں چہ جدید اُردو فکشن نے جہاں افغان مہاجرین کے لُٹے پٹے خاندانوں اور افراد پر افسانے و ناول لکھے وہاں روسیوں اور مجاہدین کے درمیان ہونے والی جنگ کو بھی بالواسطہ انداز میں اپنا موضوع بنایا اور اس کے ساتھ ساتھ نوزائیدہ ملک پاکستان پر اس کے منفی اثرات کو بھی اُجاگر کیا۔ اس طرح سے محرومیوں اور ناہمواریوں کے سبب اور بعض

اوقات ہجرت کے درمیان دہشت گردی پر مبنی نرگسیت نے جنم لیا اور نائن الیون کے سانحے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اختر لکھتی ہیں کہ؛

"سماجی جبر کے زاویے جو انسان کی قتل و غارت گردی اور تشدد پسندی سے عبارت ہیں۔ "[6]

ناولوں ‘‘شکست’’(کرشن چندر)، ‘‘آگ کا دریا’’ ‘‘میرے بھی صنم خانے’’ (قراۃ العین حیدر)، ‘‘پاگل خانہ’’ (حجاب امتیاز علی)، ‘‘صدیوں کی زنجیر’’ (رضیہ فصیح الدین)، ‘‘نادید’’ (جوگندر پال) میں بیان ہوئے ہیں۔ نوے کی دہائی کے بعد منظرِ عام پر آنے والے اُردو ناولوں میں ملکی سطح پر فرقہ واریت، دہشت گردی اور سیاسی استحصال کو بخوبی اُجاگر کیا گیا ہے۔ ان میں کراچی میں ہونے والی دہشت گردی کے واقعات، افغان جنگ کی ہولناک صورتِ حال اور اثرات، مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں استحصالی کارروائیوں اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بعد اثرات کا تجزیہ بلاشبہ اُردو ناول نگاروں کی عصری حسیّت، انسان دوستی اور سیاسی بصیرت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اُردو فکشن میں عشق و محبت کا اظہار بہت ہے۔ جب سے اُفقِ انسانیت پر خاور تہذیب کی کرنوں کی جلوہ گری کا آغاز ہوا، اسی وقت سے ہی چرچا عشق بلند ہونا شروع ہو گیا۔ تمام فکشن نگاروں نے کسی نہ کسی حوالے سے خواب جوانی کی تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس دیدۂ جاناں کی ناوک اندازی میں بعض اوقات تو نرگسیت کی سطح تک پہنچ گئے۔ حُسن و عشق کے مخصوص تصورات جو عہدِ قدیم کی داستان میں دیوی دیوتاؤں کی عشق و محبت کی ہوس پرستانہ قصوں کی زینت بنے۔ عہدِ جدید کے فکشن میں بھی اپنا عکس دکھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اخترکہتے ہیں کہ ؛

"شاعر نے نیلی آنکھوں پر الزام دھرا تو ادیب نے انسان کے دل کو موردِ الزام ٹھہرایا مگر جب سے نفسیات نے ترقی کی ہے اس وقت سے جہاں انسان کے اکثر جذبات کا تجزیہ کیا گیا ہے وہاں محبت کی بھی چھان پٹک ہوئی۔"[7]

انسان کے بنیادی اور شعوری احساسات میں سے احساسِ کمتری کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس سے شاید ہی کسی کو مفر ہو۔ ہر انسان خوبصورت، خوشحال اور ذہین ہونے کے باوجود اپنے آپ میں کسی نہ کسی خامی کا شاکی ہوتا ہے۔ ہر انسان کی یہ ازلی خواہش ہے کہ کاش! مجھ میں یہ خامی نہ ہوتی۔ اے کاش! میرے بارے میں فطرت سے یہ کوتاہی نہ ہوئی ہوتی۔ اس مسلسل احساسِ محرومی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو باقی شخصیت میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگتا ہے اور وہ شعوری یا لاشعوری طور پر اس خلا کو پُر کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے۔ انسان جب کسی کا انتخاب بہ حیثیت محبوب کرتا ہے تو اپنے خیالات و تصورات کی وجہ سے اس کے ذہن میں ایک معیار بن چکا ہوتا ہے اور محبوب وہی کہلائے گا جو اس کسوٹی پر پورا اُترے گا۔ دراصل محبوب کے پردے میں انسان اپنے آپ سے محبت کر رہا ہوتا ہے۔ البتہ محبوب اس تصور کی ایک جیتی جاگتی تصوریر بن کر سامنے آنے کی وجہ سے اس سے خراجِ کشش وصول کرتا ہے۔ یہ ایک خوش گوار واہمہ ہے کہ انسان دوسرے سے محبت کرتا ہے۔ انسان اتنا خود غرض ہے کہ بغیر کسی وجہ اور مطلب کے وہ کسی انسان کو چاہ بھی نہیں سکتا۔ وہ صرف اسی کو پسند کرے گا جو اس کے خیالات کا عکس ہو گا اور اسی پر اپنا سب کچھ نثار کر دے گا جو اس کے تصورات کا پیکر ثابت ہو گا، وہ اس کے لیے جہان بھر سے باغی ہو جائے گا۔ یہ وصف بعض اوقات اس کی نرگسیت کا مؤجب بن جاتا ہے۔

اُردو فکشن کی ایک خاص بات یہ ہے کہ تخلیق کاروں نے اپنے معاشرتی کرداروں کی سماجیاتی حساسیت کو اُجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ افراد کسی بھی معاشرت کے تہذیبی و ثقافتی عمل میں اساسی اہمیت رکھتے ہیں۔ فکشن نگاروں نے اپنے سماجی کرداروں کے ذریعے سے نرگسی نفسیات کے عوامل کی تفہیم کی ہے۔ منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کی حیثیت اور جذبات و احساسات کے اندر نرگسیت کو شہر یار نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

” منٹو کو دیوی کا روپ پسند نہیں تھا جہاں وہ مرد کے حکموں کی غلام بن کر رہ جائے۔ منٹو انہیں آزاد اور خودمختار دیکھنا چاہتے تھے۔ ایسی عورت طوائف ہی ہو سکتی تھی لیکن یہ طوائفیں بھی مرد کے مقابل ہرجائی نہیں ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں عشق کا جذبہ عام عورتوں سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل کے دروازے کسی خاص مرد کے لیے ہی کھولتی ہے ورنہ ہر روز نئے گاہک اس کے ہاں آتے جاتے رہتے ہیں انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ منٹو ایسی عورتوں کے اندر، ریاکار مردوں کے خلاف انتقام کا جذبہ دیکھنا چاہتے تھے“ [8]

‘‘ہتک’’ کی ویشیا سوگندھی سیٹھ سے انتقام لینے کے لیے سوچتی ہے کہ جب سیٹھ اس کے سامنے ہو تو وہ ۔۔۔کپڑے پھاڑ کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ سوگندھی کے ننگے جسم میں جو گوشت پوست کاڈھانچہ نظر آتا ہے دراصل وہ عورت نہیں ہے

بلکہ جو کچھ اس کے اندر چھپا ہوا ہے وہی اصلی عورت ہے۔ جسم فروش عورتیں اپنا جسم بیچتی ہیں۔ اپنے اندر کا عورت پن نہیں، ان کے اندر کی پاکیزہ عورت کائنات کی ایک ایسی قیمتی چیز ہے جسے منٹو نے بقول عصمت چغتائی گندے گھورے میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ عورت سودا چکاتے وقت جسم سے باہر کہیں اور سیر کر رہی ہوتی ہے۔ جب منٹو نے کہا تھا کہ میں عورتوں کے بارے میں وثوق سے کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتا۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہی کہاں ہوا ہے۔ عورت کا وہ تصور جو ہم لوگ اپنے دماغ میں قائم کرتے ہیں ٹھیک نہیں ہو سکتا، تو اس سے یہی ''اندر کی عورت'' مراد تھی۔ جسے دولت سے نہیں خریدا جا سکتا ہے کیوں کہ طوائف چند روپوں کے بدلے اپنا جسم کسی مرد کے سپرد کرتی ہے تو اس وقت وہ ویشیا ہوتی ہے۔ منٹو کا کہنا ہے کہ ہر عورت ویشیا نہیں ہوتی لیکن ہر ویشیا عورت ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ فطری عورت جسم بیچنے کا دھندا تو پیٹ پالنے کے لیے کرتی ہے لیکن باقی باتوں میں اس کا ردِعمل ایک نارمل عورت جیسا ہے۔

شوکت صدیقی کا ناول ''جانگلوس'' بڑے کینوس اور وسیع پس منظر کا حامل ہے۔ اس ضخیم ناول میں پنجاب کی دیہی زندگی اور جاگیردارانہ معاشرت کی نفسیات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ شوکت صدیقی نے معاشرتی حقائق کا ایسا آئینہ بنایا ہے جو جزئیات اور تفصیلات پربنی سچائی پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے کسی ناول میں اتنی سچائی اور گہرائی کے ساتھ پاکستانی معاشرے کا مطالعہ نہیں ملتا۔ شوکت صدیقی نے مرد کرداروں کے ساتھ ساتھ نسائی کرداروں کی نفسیات کو بھی پیش کیا ہے۔ ترنم جانگلوس کے کرداروں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ؛

> ''جمیلہ کی نفسیاتی گتھیوں کا سراغ لگانے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایسی عورتوں کی نمائندہ ہے جو اپنی عزتِ نفس کی خاطر گھٹن زدہ ماحول میں گھٹ کر زندگی گزار سکتی ہے مگر اپنی عزت و ناموس کو کسی بھی حال میں فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ تمام خوف و دہشت اور دھمکیوں کو نظرانداز کرکے کسی بھی طرح رحیم داد کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتی۔ بہادر اور خوددار جمیلہ اگرچے تمام مصائب اور مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے لیکن اللہ وسایا کے قتل کے بعد رحیم داد جب اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو نہایت نفرت کے ساتھ انکار کر دیتی ہے۔''[9]

احسان شاہ اور رحیم داد کی ملی بھگت سے مائی پھاتاں کی مائیوں بیٹھی بیٹی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اس کی واپسی کی شرط احسان شاہ یہ رکھتا ہے کہ وہ رحیم داد سے نکاح کر لے۔ مائیوں میں بیٹھی ہوئی لڑکی کو عزت کے ساتھ وداع کرنے کے لیے جمیلہ نے اپنی قربانی قبول کر لی اور رحیم داد کے ساتھ نکاح کر لیا۔ جمیلہ کو احسان شاہ اور رحیم داد کے تعلقات کا بھی پتہ چل گیا تھا اور اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اللہ وسایا کے قتل میں رحیم داد کا ہاتھ ہے۔ وہ اس کے کرتوتوں سے آگاہ ہو گئی تھی۔ چناں چہ وہ ایک رات سرحد پار سے اپنے بھائیوں کو بلا لیتی ہے اور اپنی تمام جاگیرداری اور تمام تر عیش و آرام کو بالائے طاق رکھ کر اور رحیم داد کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ہندوستان واپس چلی جاتی ہے اور اپنی ذات کو تذلیل سے بچا لیتی ہے۔ اس سے جمیلہ کی سیرت و کردار، اس کی وفاداری اور ثابت قدمی پر روشنی پڑتی ہے۔ رحیم داد کو جس جمیلہ کو حاصل کرنے کی تمنا تھی وہ اس سے نکاح تو کر لیتا ہے مگر ذہنی اور نفسیاتی طور پر پریشان رہتا ہے کیوں کہ اس کا ضمیر مجرم تھا۔ گویا اس سے شوکت صدیقی نے معاشرتی نفسیاتی کشمکش کو پیش کیا ہے۔

تخلیقی اور تخیلی ادب میں نفسیات کا عمل حیرت انگیز شکل میں سامنے آتا ہے۔ ایک طرف ادب میں خود ادیب کی نفسیاتی زندگی اور طبعی رجحان کا دخل بنیادی عنصر ہے جبکہ دوسری جانب لکھاری اپنے کرداروں کی نفسیات سے کام لے کر اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ حسین افسانے میں نفسیاتی عوامل و مظاہر کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ؛

> ''انسانوں کے کردار عام طور سے ایسے انسان ہوتے ہیں جن کی ذ ہنی کیفیت سے ہم جلد واقف ہو سکتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ غیر معتدل اور مریض ذہن رکھنے والے کردار بھی ہو سکتے ہیں۔ جن کے خیالوں کا بہاؤ اور عام انداز معتدل یا نارمل انسانوں سے مختلف ہو گا۔ اُن کا سمجھ لینا بھی کچھ ایسا دشوار نہ ہو گیا۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار اپنے کردار کے ذہن میں جو خیالات رکھتا ہے، اُس کی نفسی کیفیت بیان کرتا ہے وہ اُس کردار کے مادی وجود سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں۔ ''[10]

جب سے اُردو میں لوگوں کو فرائیڈ کی تحلیلِ نفسی سے واقفیت ہوئی ہے۔ نرگسیت پر مبنی ذہنی رجحانات، جنس اور لاشعور کی رو پر مبنی افسانوی ادب نے خاص صورت اختیارکر لی ہے اور اُن کے جا و بے بجا اظہار نے بہت سے افسانوں کو گورکھ دھندا بنا دیاہے۔ میرے پیشِ نظر ادب میں تجزیۂ نفس سے کام لینا یا فرائیڈ کی نفسیات کو پرکھنا نہیں ہے بلکہ مختصر افسانے میں لاشعور کے کام لینے کا مسئلہ ہے جس نے شعر و ادب میں بہت سی الجھنیں بڑھا دی ہیں۔ انسان خاص طرح کے مادی اور سماجی حالات میں جس طرح سوچتا ہے۔ اُس کا سمجھنا مشکل نہیں لیکن جو کچھ اُس کے لاشعوری ذہن میں چل رہا ہے اُس کا باہر نکلنا افسانہ نگار اپنے ذمہ لیتا ہے اور اُس کے ذہن میں وہ باتیں بھر دیتا

ہے جن کا بظاہر کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا۔ لاشعور کے نام پر افسانہ نگار بہت سی غیر متعلق باتوں کو متعلق کر دیتا ہے اور چوں کہ اس کی بنیاد مادی یا سماجی شعور پر نہیں ہوتی اس لیے جدھر چاہتا ہے خیالوں کی باگ موڑ دیتا ہے۔

اُردو فکشن میں ممتاز مفتی نے اپنے کرداروں کی بوالعجبیوں اور بعض کجرویوں کی بدولت نفسی پیچیدگیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ ایک فکشن نویس کا مقصود معاشرتی حیات کو خوش آئند بنانا ہے۔ اس لیے اشتراکیت، جمہوریت، آزادی، غلام، آمریت، مذہبی اجارہ داری، طبقاتی تنگ نظری، نسلی برتری اور نفسیاتی و جنسی الجھنیں سبھی اپنے موضوعات میں سمیٹنے کا متمنی رہتا ہے۔ ممتاز مفتی کا رویہ یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں اور ناولوں میں جنسیات اور نفسیات کو ہی پیشِ نظر رکھتا ہے۔ مرد اور عورت کے لاشعوری اور وجدانی گوشوں کی گہرائی میں اُتر کر اُس کی نفسیاتی نرگسیت کی منظر کشی کر دیتا ہے۔ فرائیڈ کی تحلیلِ نفسیPsycho Analysis کو بروئے کار لاتے ہوئے جنسی جذبات پر مبنی نرگسیت کو بیان کر دیتا ہے۔ بقول حسن :

> ”دراصل ممتاز مفتی فرائیڈ، ہیولاک اور ایلس سے متاثر ہیں اور ان کے زیراثر ہی وہ اپنے افسانوں میں کرداروں کی باطنی پیچیدگیوں اور ان کے ارادوں کی جھلک دکھاتے ہیں۔ انہوں نے عورت کی نشوونما کے مراحل کو موضوع بناتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ مختلف تعلقات کے جال میں عورت کن جذباتی کیفیات سے گزرتی ہے۔“[11]

درحقیقت ممتاز مفتی نے جنس کی بجائے اس کے پیچھے کارفرما عوامل کی جستجو کی ہے اور جنسی واردات کی بجائے اس پس منظر کو بیان کیا ہے جس سے برصغیر نبرد آزما تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرد عورت کے تعلقات کا ذکر خصوصی طور پر عورت کا نفسیاتی مطالعہ اگر کوئی پیش کرتا تو اسے فحاشی سے تعبیر کیا جاتا لیکن ممتاز مفتی نے عورت کے اس پوشیدہ پہلو کی عکاسی اور مرد کی جنسی نفسیات کے متعدد پہلوؤں کو اس طرح پیش کیا کہ جنس کے ذکر کو باقاعدہ فن بنا دیا۔ ممتاز مفتی نے جنسی اور نفسیاتی تجزیہ کو اپنا موضوع بنایا اور اس موضوع پر جو کچھ لکھا وہ اس قدر سنبھل کر اور سوچ کر لکھا کہ جو چیز ممتاز مفتی سے پہلے بدنام تھی اس نے ایک وقیع علمی موضوع کی حیثیت اختیار کر لی۔

بیدیؔ کے یہاں جنس پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔ آل احمد سرور نے بیدیؔ کی حقیقت نگاری کو نفسیاتی حقیقت سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے کرداروں کے عمل سے ذہنی اور نفسیاتی عمل سے پس منظر تک اور اس پس منظر سے پھر عمل تک کا سفر کرکے دکھایا ہے۔ سرور کے بقول :

> ”بیدیؔ کے یہاں جنس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بیدیؔ نے ایک طرح سے اپنی صفائی کر دی ہے کہ وہ جنس پر ایک ذ مہ داری کے احساس کے ساتھ لکھتے ہیں۔ بیدیؔ یہ یہاں جنس ارتعاش پیدا کرنے یا مرتعش ہونے کے لیے نہیں ہے۔“[12]

لاجونتی میں عورت عورت رہنا چاہتی ہے، دیوی نہیں کیوں کہ عورت دیوی بھی ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے مگر دیوی عورت نہیں صرف دیوی ہوتی ہے۔ بیدیؔ فرد کی نفسیات کا ہی بے مثل بیان نہیں کرتے بلکہ ان کے یہاں سماجی معنویت بھی پائی جاتی ہے گو وہ سماجی معنوعیت پر لمبی چوڑی تقریریں نہیں کرتے۔ تلوار کا وہ وار بھرپور ہوتا ہے جو کر جائے کام اپنا لیکن نظر نہ آئے، بیدیؔ نے ان مردوں، بچوں اور بوڑھوں کا ایک نگارخانہ ہمیں دیا ہے جو فرشتے یا شیطان نہیں، انسان ہیں۔ جن کے یہاں کمزوریاں اور جن کے یہاں ایک طاقت کا بھی احساس ہوتا ہے۔

حوالہ جات

١. اشرف، ڈاکٹر خالد، (1994ء)، برصغیرمیں اُردو ناول، دہلی، مجلس ترقئ اُردو (ہند)، ص:290
2. خان، ڈاکٹر محمد عالم، (2012ء)، اُردو افسانے میں رومانی رجحانات، لاہور، مجلس ترقئ اُردو، ص:443
3. قزلباش، سلیم آغا، (1995ء)، جدید اُردو افسانے کے رجحانات، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ص:394-392
4. اِسّر، دیویندر، (1963ء)، ادب اور نفسیات، دہلی، مکتبہ شاہرہ، ص:116-117
5. رحمن، شکیل، (1951ء)، ادب اور نفسیات، پٹنہ، اشاعت گھر، ص:52
6. اختر، ڈاکٹر ثروت، (2021ء)، اُردو ادب میں دہشت گردی کی ارتقائی عکاسی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، کراچی، انجمن ترقئ اُردو پاکستان، ص:317
7. اختر، ڈاکٹر سلیم، (2004ء)، ہماری جنسی اور جذباتی زندگی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص:23-22
8. شہریار، ڈاکٹر پرویز، (2011ء)، منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ص:164-163
9. ترنم، زیبا، (2014ء)، شوکت صدیقی کی فکشن نگاری کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ، یو۔پی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (انڈیا)، ص:182
10. حسین، سید احتشام، (1949ء)، مختصر افسانہ میں نفسیات کا عنصر، مشمولہ: ادبِ لطیف افسانہ نمبر، شمارہ:1، جلد:29، ص:6
11. حسن، ڈاکٹر ریحان، (2011ء)، ممتاز مفتی حیات اور ادبی خدمات، دہلی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، ص:57
12. نارنگ، پروفیسر گوپی چند، (2002ء)، اُردو افسانہ روایت اور مسائل مشمولہ: سرور، آلِ احمد، بیدی کی افسانہ نگاری ‘‘صرف ایک سگریٹ’’ کی روشنی میں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص:369